تحقیق وتنقید

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بیت المال کا تصوّر اور اس کی کارکردگی

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

بیت المال اسلام کے اقتصادی نظام کی مرکزی کڑی ہے۔ اسے اپنے اعلیٰ مقصد اور کارآمد مشاغل کی وجہ سے اسلام کے معاشی اداروں میں خاص اہمیت و وقعت حاصل ہے۔ بیت المال ابتداءً وسائلِ ریاست کے جمع و تحفظ اور ان کے مصارف کی نگرانی کے لیے قائم کیا گیا تھا لیکن تہذیب و تمدن کی ترقی اور نظم و نسق میں وسعت کے ساتھ اس کے مشاغل میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ آمد و خرچ کی نگرانی کے ساتھ ساتھ یہ ریاست کی اقتصادی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے اور اس کے فلاحی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کا اہم و موثر وسیلہ بن گیا[۱] اور حکومت کی انتظامی ضروریات کی تکمیل، فقراء و مساکین کی کفالت، لاوارث جائداد و اموالِ یتامیٰ کی نگہداشت، امانت و قرض کے معاملات کی انجام دہی، ایک مقام سے دوسرے مقام تک رقوم کی منتقلی اور زراعت و تجارت و صنعت کی ترقی کے اہتمام جیسے امور اس کے دائرہ کار میں شامل ہو گئے[۲] جدید دور کے ایک عرب مورخ نے بجا طور پر بیت المال کو موجودہ زمانہ کی مالی وزارت سے تعبیر کیا ہے جس کی آمدنی کے مختلف (لیکن متعین) ذرائع ہوتے ہیں اور جس کے مصارف کی جہات بھی مختلف ہوتی ہیں[۳]۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کے تصور بیت المال کی رو سے یہ ضروری نہیں کہ بیت المال کی کوئی آمدنی اس کے خزانہ میں جمع کی جائے اور پھر وہاں سے متعینہ مدیں خرچ کے لیے نکالی جائے بلکہ اگر بیت المال کے وسائل کو براہِ راست ان کے مصارف میں استعمال کیا جائے تو بیت المال کا مقصد و منشا پورا ہو جاتا ہے گرچہ ظاہری طور پر

لفظ بیت المال کا ذکر نہ آئے[۴]

ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ حکومت اس ملک اور خود مسلمانوں کی سیاسی وثقافتی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ اس عہد کی تاریخ اور مسلم تاریخ میں اس اعتبار سے گہرا ربط پایا جاتا ہے کہ اس عہد کے ہندوستان میں جو سیاسی اصول وضوابط بنائے گئے اور انتظامی شعبے قائم کیے گئے وہ کافی حد تک مشرق وسطیٰ کی مسلم حکومتوں سے مستعار تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حکومت بادشاہی نظام پر مبنی تھی اور اس کی کارکردگی میں تیموری اصول جہانبانی کے بہت سے اثرات پائے جاتے تھے لیکن اس کے رہنما اصولوں اور ترکیبی عناصر میں کافی حد تک مسلم طرز حکمرانی کا عمل دخل بھی ملتا ہے۔ اس عہد میں دیوانِ خراج، قضا، احتساب وغیرہ جیسے متعدد ایسے انتظامی شعبہ جات قائم تھے جو واضح طور پر ایشیا اور افریقہ کے مختلف علاقوں میں پہلے کی مسلم حکومتوں میں پائے جاتے تھے۔ اسی طرح نظم ونسق کے دائرے بالخصوص مالیات میں بہت سی ایسی اصطلاحیں رائج تھیں جو بنیادی طور پر اسلام کے معاشی نظام کا جز تھیں مثلاً زکوٰۃ، خراج، جزیہ، عشور، عشری وخراجی، مزارعت ومضاربت، بیت المال وغیرہ۔ اسلام کے سیاسی وانتظامی شعبوں کی جو اصطلاحات عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں رائج ہوئیں ان میں کچھ ایسی تھیں جن کا اصل مفہوم باقی رہا جبکہ بعض اصطلاحوں کے معنیٰ یہاں کے سیاق میں یا تو بدل گئے یا ایک محدود مفہوم میں ان کا استعمال رائج ہوا اور پھر کچھ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ایک اصطلاح اپنے اصل مفہوم کے ساتھ تبدیل شدہ معنیٰ میں بھی مستعمل ہوئی۔ اسی پس منظر میں ذیل میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بیت المال کے تصور اور اس کی کارکردگی کا مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے نظم ونسق بالخصوص مالی نظام سے بحث کرتے ہوئے بعض جدید مورخین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت بیت المال کی حیثیت محض ایک ایسے خزانہ کی تھی جہاں لاوارث جائداد یا غیر موروثہ ترکہ جمع کیا جاتا تھا اور جس کی آمدنی فقراء و مساکین میں صرف کی جاتی تھی اور ان مورخین کے بقول بیت المال اور کسی خیراتی ادارہ کے دائرہ کار میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا[۵] لیکن مستند تاریخی مآخذ کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت بیت المال کا تصور اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس کا دائرہ کار کافی پھیلا ہوا تھا۔ عہدِ سلطنت کے مختلف مآخذ میں یہ مذکور ہے کہ اس وقت بیت المال کے ذرائع آمدنی میں زکوٰۃ، خمس غنائم، جزیہ، عشور اور غیر موروثہ اموال شامل تھے[۶] سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ — ۱۳۸۸ء) کی بابت خاص طور سے مورخین یہ شہادت پیش کرتے ہیں کہ اس نے

بیت المال کے وسائل کو ان محاصل تک محدود رکھا جو شریعت سے ثابت تھے اور باقی دیگر محاصل کو یک قلم ممنوع قرار دیا۔[7] بیت المال کے مذکورہ وسائل کے سلسلے میں معاصر فقہاء کی وضاحت اور سلاطین دہلی کی ہدایات کے علاوہ اس کے بھی ثبوت فراہم ہوتے ہیں کہ یہ محاصل واقعۃً بیت المال کی آمدنی کا جزء بنتے تھے۔ سلطان التمش (۱۲۱۰ـ ۱۲۳۵ء) کے بارے میں معاصر مورخ منہاج السراج کے بیان سے یہ تصدیق ہوتی ہے کہ مالِ غنیمت حکومت کی آمدنی کا حصہ بنایا جاتا تھا اگرچہ بعض اوقات خمس سے زیادہ حکومت کے خزانہ میں داخل کیا جاتا تھا[8] جو ظاہر ہے کہ شرعی ضابطہ کے خلاف تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶ـ ۱۳۱۶) اور قاضی مغیث کے مابین جن مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا تھا ان میں ایک یہ بھی تھا کہ ایام شہزادگی میں اس (علاء الدین خلجی) نے دیوگیر (دولت آباد) میں فوجی مہم کے دوران جو مال حاصل کیا ہے وہ اس کا اپنا ہے یا بیت المال کا حق ہے۔ اس کے جواب میں قاضی نے یہ عرض کیا تھا کہ یہ مال لشکرِ اسلام کی کوششوں کے نتیجہ میں ہاتھ آیا ہے اس لیے یہ بیت المال کا حق ہے سلطان کا اس پر کوئی ذاتی اختیار نہیں ہے۔[9] اس مباحثہ سے اس وقت مال غنیمت میں بیت المال کا استحقاق ثابت ہوتا ہے لیکن یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس میں بیت المال کا کس قدر حصہ ہوتا تھا۔ سلطان فیروز شاہ کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پیشرو سلاطین کے دور میں مالِ غنیمت کی تقسیم میں بے ضابطگی پائی جاتی تھی اور ۱/۵ کے بجائے ۴/۵ حصہ بیت المال کے لیے مخصوص کر لیا جاتا تھا سلطان نے اس کی اصلاح کی اور شرعی تناسب کے مطابق بیت المال کو غنائم کے صرف ۱/۵ حصہ کا حق دار قرار دیا۔[10] اس پر عمل آوری کی تاکید سلطان کی اس ہدایت میں بھی ملتی ہے جو اس نے جاج نگر (اوڑیسہ) کی مہم میں کامیابی کے بعد جاری کی اور وہ یہ کہ جب مالِ غنیمت بلاد اسلام میں پہنچے تو حکم خداوندی اور شریعت مصطفوی کے مطابق اس کی تقسیم کی جائے[11] ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کے قیام سے بہت پہلے جب محمد بن قاسم کی قیادت میں عربوں نے سندھ میں فتوحات حاصل کیں تو مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس) مسلم حکومت کے خزانہ میں داخل کیا گیا جیسا کہ تاریخ سندھ کے مستند ماخذ چچنامہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے[12] جہاں تک جزیہ کے بیت المال کی آمدنی کا ذریعہ بننے کا تعلق ہے سلطان فیروز شاہ سے قبل اس کی باقاعدہ تشخیص وتحصیل کا ذکر نہیں ملتا اگرچہ معاصر ماخذ میں اس کے متفرق حوالے دستیاب ہیں۔ معاصر مورخ ضیاء الدین برنی سلطان علاء الدین اور قاضی مغیث کے مکالمہ کے حوالے

سے سلطان کا یہ تاثر نقل کرتے ہیں کہ زمین دار طبقہ کے ہندو (خوط، مقدم اور چودھری) جزیہ اور دوسرے محصول ادا نہیں کرتے اور عیش و عشرت کی زندگی گذارتے ہیں[۱۴] جبکہ یہی مورخ عہد فیروز شاہی کی یہ صورتِ حال پیش کرتے ہیں کہ چند تنکہ (عہد سلطنت کا نقرئی سکہ) جزیہ ادا کر کے مختلف سماجی حقوق اور معاشی آسانیوں سے محظوظ ہوتے ہیں[۱۵] فیروز شاہ نے جیسا کہ معاصر مآخذ میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں اسلامی قانون کے مطابق جزیہ کے نفاذ پر زور دیا اور اسے واضح طور پر بیت المال کے معروف وسائل کا حصہ قرار دیا[۱۶] اور اس سے اہم یہ کہ سلطان نے رائج الوقت سکہ کے مطابق اس کی شرح متعین کی اور امیر، متوسط و ادنیٰ طبقہ کے لوگوں پر بالترتیب ۴۰، ۲۰ و ۱۰ تنکہ سالانہ جزیہ مقرر کیا[۱۷] جبکہ محمد بن قاسم کے دور میں شرح جزیہ کے طور پر ۴۸، ۲۴، و ۱۲ درہم کا ذکر ملتا ہے[۱۸] جو قدیم مسلم حکومتوں میں جزیہ کی عام شرح تھی۔ نظم جزیہ کے سلسلہ میں فیروز شاہ کا یہ اقدام بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس نے برہمنوں پر بھی اسے عائد کیا جو پہلے کے ادوار میں اس سے مستثنیٰ تھے سلطان کا یہ اقدام معاصر علماء کے اس متفقہ فیصلہ پر مبنی تھا کہ برہمن اپنے سماجی مشاغل اور معاشی مصروفیات کی روشنی میں شریعت کی رو سے اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں[۱۹]

اُس وقت ریاست کے وسائل میں خراج سب سے معروف اور اہم وسیلہ تھا اس لیے بیت المال کی آمدنی میں اس کے حصہ کا زیادہ ہونا ایک فطری امر تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ معاصر مورخ برنی نے سلطان علاء الدین اور قاضی مغیث کے مکالمہ میں بیت المال کی صفت یہ بیان کی ہے کہ جو کسانوں کے خراج سے جمع ہوتا ہے (واز بیت المال کہ از خراج رعایا جمع شود[۲۰]) یہی حقیقت عمال و محصلینِ خراج کے نام جاری کردہ فیروز شاہ کی اس ہدایت سے بھی واضح ہوتی ہے کہ کسانوں سے محصول کی وصولی میں سختی نہ برتی جائے اور نہ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ ڈالا جائے اس لیے کہ کسان ہی خزانۂ بیت المال میں اضافہ کا ذریعہ بنتے ہیں[۲۱] سلطان نے خان جہاں کو وزیر مقرر کرتے وقت اس کی جو ذمہ داریاں یاد دلائیں ان میں نظم محاصل کی نگرانی اور حکومت کی آمدنی میں اضافہ کی تدبیر بھی شامل تھی اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ سلطنت کی تعمیر و ترقی بیت المال کی آبادی اور ذرائع آمدنی میں اضافہ سے منسلک ہے[۲۲] قریب قریب اسی خیال کی ترجمانی معاصر مورخ عفیف کے بیان کردہ اس اصول میں ملتی ہے کہ اگر خراج وصول کرنے والوں (عُمّال) کی کارکردگی پر کڑی نظر نہ رکھی جائے تو بیت المال کی آمدنی میں کمی واقع ہوتی ہے[۲۳] یہ تمام تفصیلات اس حقیقت کی غمّاز ہیں کہ عہدِ سلطنت میں خراج نہ صرف

یہ کہ بیت المال کی آمدنی کا حصہ بنتا تھا بلکہ اس کا اہم و معتدبہ حصہ تھا۔

اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ خراج کے مثل عشر (زمین کی پیداوار کا دسواں حصہ) بھی بیت المال کے معروف وسائل میں شامل تھا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اور یہ بھی مآخذ سے ثابت ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ کی فتوحات کے بعد ان لوگوں کی زمین کو عشری قرار دیا تھا جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی کے مطابق ان سے عشر وصول کیا جاتا تھا[۲۳] مزید براں دہلی سلطنت کے ابتدائی دور میں عشر کی تحصیل اور اس سے متعلق بعض ضابطوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ — ۱۲۱۰ء) نے بالخصوص لاہور کی بابت یہ حکم جاری کیا تھا کہ جو زمینیں مسلمانوں کی مملوکہ ہیں ان پر شریعت کے مطابق عشر یا نصف عشر عاید کیا جائے اور اس کے علاوہ ان سے کچھ نہ وصول کیا جائے[۲۴]۔ اس میں شبہ نہیں کہ سلطان التمش کے دور میں خراجی زمین کے مسائل کی خصوصی وضاحت ملتی ہے[۲۵] لیکن عشری و خراجی کی تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عشری زمینیں موجود تھیں اور عشر حکومت کی آمدنی کا ذریعہ بنتا تھا۔ عہد سلطنت کے سرکاری خطوط و دستاویزات کے مشہور مجموعہ "انشاء ماہرو" میں صاف طور پر یہ مذکور ہے کہ آراضی ہندو حالت سے خالی نہیں یا تو وہ خراجی ہوگی یا عشری[۲۶] مذکورہ سلاطین کے علاوہ دیگر حکمرانوں کے عہد میں بھی عشر کا حوالہ ملتا ہے[۲۷] لیکن اسے بیت المال کے وسائل میں شامل کیے جانے کی صراحت اور اس کی باضابطہ تحصیل کے شواہد فیروز شاہ کے زمانہ میں فراہم ہوتے ہیں معاصر مآخذ اس پر متفق ہیں کہ سلطان نے شرعی قوانین کی روشنی میں نظم محاصل کی اصلاح کی اور بیت المال کے لیے ان محاصل کی وصولی پر زور دیا جو شریعت سے ثابت ہیں[۲۸] یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ بیت المال کے ایک ذریعہ آمدنی کی حیثیت سے خراج کی بہ نسبت عشر کے حوالہ کی کمیابی کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت عشری زمینیں بہت کم پائی جاتی تھیں جیسا کہ عہد وسطیٰ کے بعض ہندوستانی علماء نے اپنی تصنیفات میں اس موقف پر خاص زور صرف کیا ہے[۲۹]

جہاں تک عہد سلطنت میں نقود یا سامانِ تجارت پر عاید ہونے والی زکوٰۃ کے بیت المال میں داخل کیے جانے کا تعلق ہے اصولی و قانونی طور پر اس کا ذکر فقہی و تاریخی مآخذ میں بکثرت ملتا ہے۔ لیکن مورخین حکومت کے ذریعہ اس کی تحصیل اور متعینہ مصارف میں اس کے خرچ کرنے کی تفصیلات بہت کم پیش کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ خود زکوٰۃ ادا کرتے تھے یا اپنی صوابدید کے مطابق اس کی رقوم کو اس کے متعینہ مصارف

میں خرچ کر دیتے تھے تاہم زکوٰۃ سے متعلق بعض متفرق حوالوں سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے نظم پر کسی نہ کسی حد تک حکومت کا اختیار قائم تھا۔ مثال کے طور پر معاصر مورخ برنی کے بیان کے مطابق اس وقت محتسب کے فرائض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ امراء سے زکوٰۃ وصول کر کے فقراء میں تقسیم کریں[۳۱]۔ اسی دور کے ایک دوسرے مورخ یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ جب ایک کثیر العیال غریب شخص سلطان فیروز شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مدد کی درخواست کی تو سلطان نے اس کے بارے میں تفتیش حال کے بعد یہ حکم جاری کیا کہ اسے شہر کی زکوٰۃ وعشور کی مد سے روزانہ ایک تنکہ عطا کیا جائے[۳۲]۔ ظاہر ہے کہ یہاں شہر کی زکوٰۃ سے مراد نقود یا مالی تجارت کی زکوٰۃ ہی ہو سکتی ہے۔ مزید براں اسی زمانہ کی ایک فقہی تالیف میں یہ استفتاء مذکور ہے کہ اگر بادشاہ کسی سے جرمانہ کے طور پر مال وصول کرے اور جرمانہ ادا کرنے کے ادائیگی کے وقت یہ نیت کرے کہ جو کچھ وہ بادشاہ کو دے رہا ہے وہ اس کے مال کی زکوٰۃ ہے تو کیا وہ شریعت کی رو سے زکوٰۃ سے بری الذمہ ہو جائے گا[۳۳]۔ یہ سوال بھی اس حقیقت کا غماز ہے کہ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ زکوٰۃ کے علاوہ سامانِ تجارت کے درآمد وبرآمد یا ایک مقام سے دوسرے مقام تک اس کی منتقلی پر عائد کیا جانے والا محصول (کسٹم ڈیوٹی یا چنگی) بھی اُس وقت بیت المال کی آمدنی کا ذریعہ ہوتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں اس محصول کے لیے اصل اصطلاح (عشور) کے علاوہ زکوٰۃ، تمغا، چہل یک وچہل دو کے الفاظ بھی استعمال ہوتے تھے[۳۴]۔ بیت المال کے وسائل میں اس محصول کے شامل ہونے کے جو شواہد ملتے ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ملتان کے گورنر عین الدین ماہرو کو یہ شکایت ملی کہ ساحلی شہر اُچ (یا اوچھ) کے علاقہ میں اس محصول کا نظم بے ضابطگی وخرابی کا شکار ہے تو اس نے مقامی حاکم کو اس خرابی کے دور کرنے کی ہدایت کی اور یہ صراحت کی کہ اس محصول کی بے ضابطہ وصولی بیت المال کے نقصان کا باعث بنتی ہے[۳۵]۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ عہد سلطنت میں وہ تمام چیزیں بیت المال کی آمدنی کا ذریعہ بنتی تھیں جو اصولی طور پر اسلام میں اس کے وسائل کا حصہ شمار کی جاتی ہیں۔ اس طرح وسائل کے اعتبار سے اس وقت بیت المال کا ایک وسیع تصور پایا جاتا تھا اور اسے عوامی خزانہ (پبلک ٹرژری) کے مترادف قرار دینا غلط نہ ہوگا۔

عہد مغلیہ میں انتظامی شعبوں کی وسعت کے ساتھ نئے سرے سے ان کی تنظیم عمل میں آئی۔ مغل بادشاہوں میں اکبر کا زمانہ (۱۵۵۶ — ۱۶۰۵ء) انتظامی اصلاحات کے لیے معروف ہے۔ عہد اکبری کے مشہور مجموعہ اصول وضوابط "آئین اکبری" سے یہ واضح ہوتا ہے کہ محاصل اراضی کے خزانہ کے علاوہ (سرکاری) خزانہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک پیشکش کے لیے، دوسرا غیر موروثہ اموال کے لیے، تیسرا تحفہ وتحائف کے لیے اور چوتھا ان نقود (سونا وچاندی) کے لیے جن کے برابر بادشاہ کو تولا جاتا تھا اور جنھیں خیرات کے طور پر تقسیم کیا جاتا تھا۔[۳۶] آئین کی بیان کردہ اس تقسیم خزانہ جات میں بیت المال کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ عہد جدید کے مشہور مورخ سر جادوناتھ سرکار نے آئین اکبری کی مذکورہ بحث کے حوالہ سے لاوارث جائداد کے خزانہ کو بیت المال کا نام دیا ہے جو اپنی جگہ پر محل نظر ہے۔[۳۷] لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عہد اکبری کے دیگر تاریخی ماخذ میں بیت المال کے متفرق حوالے ملتے ہیں جن سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیت المال کے نام سے ایک خزانہ ضرور پایا جاتا تھا۔[۳۸] اورنگزیب عالمگیر کے عہد (۱۶۵۸ — ۱۷۰۷ء) میں بھی مختلف حصوں میں خزانہ کی تقسیم جاری رہی۔ اس عہد کے دستاویزی ماخذ میں عام طور پر چار خزانوں کا ذکر ملتا ہے۔ خزانۂ عامرہ یا بیت الخراج، خزانہ نقایا، خزانہ صدقہ اور خزانۂ جزیہ۔[۳۹] اس تقسیم میں بھی بیت المال شامل نہیں ہے لیکن اسی عہد کی تاریخی کتب ودستاویزات میں بیت المال کا ذکر بار بار آتا ہے اور ان حوالوں پر ان کے سیاق وسباق کے ساتھ نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بیت المال کو ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی اور اس کا اپنا ایک نظم قائم تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ تمام اموال جن کے لیے الگ خزانوں کا ذکر کیا گیا ہے بیت المال کے وسائل میں شامل کیے گئے ہیں جیسا کہ آنے والی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

اس سے پہلے یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ عہد سلطنت میں مال غنیمت کا خمس بیت المال کے معروف وسائل میں شامل تھا۔ عہد مغلیہ میں اس کی بابت کوئی واضح ثبوت نہیں مل پایا ہے لیکن شہزادہ محمد معزالدین کے نام اورنگزیب کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئی فتوحات بھی بیت المال کی آمدنی کا ذریعہ بنتی تھیں۔ بادشاہ شاہزادہ کو قلعہ ترکند ونول (واقع در دکن) کی فتح پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بیت المال کے وسائل میں اضافہ کی خواہش کا تقاضا یہی ہے کہ مزید فتوحات کے لیے کوشش جاری رکھی جائے۔[۴۰] بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ نئی

فتوحات کی آمدنی سے مراد مالِ غنیمت کا حصول ہے۔ اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں غیر مسلموں سے جزیہ کی تحصیل اور متعلقہ قوانین کے نفاذ کی تفصیلات متعدد ماخذ میں دستیاب ہیں[۱۴۱]۔ اوپر ذکر کیا گیا کہ بادشاہ نے اس محصول کے لیے علیحدہ خزانہ تشکیل دیا تھا لیکن دوسری جانب اسی عہد کے ایک ماخذ کے بیان سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ جزیہ بیت المال کی آمدنی کا حصہ بنتا تھا اس لیے کہ اس میں امینِ جزیہ کی جانب سے جزیہ کی رقوم میں خرد برد کو بیت المال میں بیجا تصرف سے تعبیر کیا گیا ہے[۱۴۲]۔ اسلام کے اقتصادی نظام کی رو سے مسلم و غیر مسلم تاجروں سے کسٹم ڈیوٹی یا چنگی کے طور پر وصول کیا جانے والا محصول (عشور) بیت المال کے معروف وسائل میں شامل ہے۔ عہد سلطنت میں بالخصوص فیروز شاہ کے زمانہ میں اس اصول پر عمل آوری کا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ بعد کے دور میں اس محصول کے نظم میں جو خرابی آگئی تھی اورنگ زیب نے اس کے اصلاح کی کوشش کی اور قانونِ شریعت کے مطابق اس کے وجوب کا نصاب مقرر کیا اور مسلم اور ہندو تاجروں کے لیے سامان تجارت کی قدر و قیمت کے اعتبار سے ڈھائی فیصد و پانچ فیصد اس محصول کی شرح متعین کی[۱۴۳] اورنگزیب کے زمانہ میں یہ محصول بیت المال کے ذرائع آمدنی میں شامل تھا۔ مثال کے طور پر اورنگزیب نے مسلمانوں کے حق میں اس محصول کی معافی کا اعلان کیا اس معافی کے بعد بعض مسلمانوں نے ہندوؤں کے مال کو اپنے نام سے ایک مقام سے دوسرے مقام منتقل کرنے کی نازیبا حرکت شروع کی بادشاہ کو جب اس کی خبر ملی تو اس نے اسے بیت المال کے نقصان اور عام لوگوں کی حق تلفی سے تعبیر کیا اور نتیجۃً مسلمانوں کے حق میں اس کی معافی کو منسوخ کرتے ہوئے حسبِ دستور سابق انھیں بھی اس کی ادائیگی کا پابند قرار دیا[۱۴۴]۔ اس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوؤں سے وصول کیا جانے والا عشور[۱۴۵] وسائل بیت المال کا جز بنتا تھا۔ اس صورت میں اس بات کے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مسلمان تاجروں سے موصول ہونے والا یہ محصول بھی بیت المال کی آمدنی میں شامل ہوتا تھا۔ فقہی ماخذ بلا کسی تفریق کے مسلم و غیر مسلم تاجروں پر عاید کیے جانے والے عشور کو بیت المال کا حق قرار دیتے ہیں[۱۴۶]۔

عہد مغلیہ میں بیت المال کے وسائل میں جس چیز کا سب سے زیادہ ذکر ملتا ہے وہ لاوارث ترکہ ہے۔ اس عہد کے بعض اہم ماخذ میں بیت المال کی خاص آمدنی اس مال کو بتایا گیا ہے جو لاوارث ہونے کے سبب حکومت کی تحویل میں لیا جائے[۱۴۷]۔ بلا استثنار

تمام مغل بادشاہوں کے زمانۂ حکومت میں یہ مسلمہ اصول معمول بہ رہا ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر کوئی (شرعی) وارث چھوڑے وفات پا جاتا تو اس کی جائداد بحق سرکار ضبط ہو کر بیت المال کی ملک ہو جاتی یہ قانون عام رعایا سرکاری ملازمین اور مسلم و غیر مسلم سب کے سلسلہ میں یکساں طور پر نافذ العمل تھا۔ یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ اسلام کے قانونِ وراثت میں یہ مشہور جزئیہ ملتا ہے کہ متوفی کے ذمہ اگر کسی کا کوئی مطالبہ ہے تو اس کے ترکہ سے اس کی ادائیگی کے بعد ہی باقی ماندہ اموال کو اس کے ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا اور اگر کسی متوفی کا کوئی وارث نہیں ہے تو اس کے ترکہ کا حقدار بیت المال ہوگا۔[۴۸] بادشاہ اکبر کے زمانہ میں اس سے متعلق جو قانون جاری کیا گیا تھا اس کی وضاحت معاصر مورخ بدایونی کے یہاں ان الفاظ میں ملتی ہے کہ اگر میت کا کوئی وارث ہو اور اس کے ذمہ حکومت کا نہ تو کوئی مطالبہ ہو اور نہ اس کا تعلق شعبۂ مالیات کی کسی ملازمت (عمل داری، فوطہ داری و کروری) سے ہو تو اس کا چھوڑا ہوا مال وارث کے حوالہ کر دیا جائے ورنہ اسے بیت المال میں داخل کیا جائے۔[۴۹] جہانگیر نے تخت نشینی کے بعد جو بارہ مشہور ضوابط جاری کیے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ مسلم و غیر مسلم متوفی کی جائداد اس کے ورثہ کے حوالہ کر دی جائے اور لاوارث جائداد سرکاری تحویل میں لی جائے۔[۵۰] اورنگزیب نے ۱۶۶۷ء میں اسی نوعیت کا صاف صاف حکم یہ جاری کیا کہ اگر عملۂ حکومت (بندہائے بادشاہی) میں سے کوئی فوت کر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو اور نہ ہی حکومت کے ذمہ اس کا کوئی مطالبہ ہو تو اس کی چھوڑی ہوئی جائداد بیت المال کے نگراں کے سپرد کر دی جائے اور اگر اس کے ذمہ حکومت کا کوئی مطالبہ واجب الادا ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد باقی اموال بیت المال میں جمع کر دیے جائیں۔[۵۱] لاوارث جائداد سے متعلق مغل بادشاہوں کی مذکورہ ہدایات کو سمجھنے کے لیے یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ مغل حکومت کا یہ مسلمہ اصول تھا کہ سرکاری افسران میں سے جو شخص وفات پا جاتا تھا اس کا چھوڑا ہوا مال بحق سرکار ضبط (Escheat) کر لیا جاتا تھا اس کے ذمہ اگر حکومت کا کوئی قرض وغیرہ ہوتا تو اس کی ادائیگی کے بعد باقی ماندہ ترکہ اس کے وارثین میں تقسیم کر دیا جاتا اور اگر متوفی لاوارث ہوتا تو اس کا ترکہ بیت المال کی ملک قرار پاتا اس اصول پر عمل آوری میں مسلم و غیر مسلم افسرانِ حکومت کے مابین کوئی تفریق نہیں برتی جاتی تھی۔[۵۲]

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ لاوارث اموال اور بیت المال سے متعلق مذکورہ ضابطہ صرف منقولہ جائداد تک محدود نہ تھا بلکہ زرعی جائداد کے بارے میں بھی اس ضابطہ

کے جاری ہونے کے ثبوت ملتے ہیں اورنگزیب نے اپنی بادشاہت کے چوتیسویں سال (۱۶۹۱ء) یہ حکم جاری کیا کہ مدد معاش کی آراضی رکھنے والا اگر وفات پا جائے اور ذوی الفروض، عصبہ یا ارحام میں سے کوئی اس کا وارث موجود نہ ہو تو اس کی آراضی بیت المال کے حق میں واپس لے لی جائے[۵۴] اگرچہ یہ حکم مدد معاش کی آراضی کے لیے خاص تھا لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ عام آراضی کے بارے میں بھی یہی معمول بہ تھا اس لیے کہ لاوارث ہونے کی صورت میں متوفی کے اموال کو بیت المال کی تحویل میں لینے کا مختلف مآخذ میں جہاں جہاں ذکر آیا ہے وہاں نقود کی قید نہیں بلکہ عام انداز میں 'جملہ اموال' کا حوالہ ملتا ہے۔ عہد مغلیہ میں غیر موروثہ آراضی پر بیت المال کے حقوق ثابت ہونے کے ضمن میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عہد کے بعض علماء نے ہندوستان کی بیشتر آراضی کو غیر موروثہ تصور کرتے ہوئے بیت المال کی ملک قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہاں کے زیادہ تر علاقے بزور (عنوۃً) مفتوح ہوئے اور اس امر کے قطعی شواہد موجود نہیں کہ مفتوحہ آراضی غانمین میں تقسیم کی گئی اور نہ ہی یہ ثبوت ملتا ہے کہ خراج یا مقررہ محصول کے عوض مفتوحہ زمینوں پر سابق مالکین (ہندو) کا قبضہ بحال رکھا گیا۔[۵۵] یہ علماء اپنے موقف کی تائید میں ایک اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ان زمینوں کے اصل مالک یا تو فوجی مہم کے دوران تباہ و برباد ہو گئے یا پھر اپنا اصل مقام چھوڑ کر ادھر ادھر منتقل ہو گئے اور پھر ان زمینوں پر حکومت کی اجازت کے بغیر ایسے لوگ قابض ہو گئے جن کا اصل مالکین سے کوئی صلبی یا نسبی رشتہ نہیں تھا۔ ایسی صورت میں ان زمینوں کی نوعیت ایسی ہو گئی کہ ان کے اصل مالک (سابق یا موجودہ) کا کچھ پتہ نہیں[۵۶] اس لیے بہ لامحالہ زمینیں لاوارث زمینوں کے زمرہ میں آکر بیت المال کی ملک قرار پائیں۔ ان علماء کے خیال میں بیت المال کی ان آراضی میں سے اگر سلطان یا بادشاہ کسی شخص کو اس کی دینی یا علمی خدمت کے عوض کوئی حصہ عطا کرتا ہے یا کسی کو مدد معاش کے طور پر اس میں سے کوئی قطعہ حوالہ کرتا ہے اور وہ شخص سلطان کی اجازت سے اسے اپنی کاشت میں لاتا ہے تو وہ زمین اسی کی ملک ہو گی اور عشری قرار پائے گی۔[۵۷]

لاوارث جائداد کے علاوہ اس شخص کے اموال بھی بیت المال کی تحویل میں لے لیے جاتے تھے جو کسی جرم شنیع (قتل وغیرہ) کے ارتکاب کے بعد راہ فرار اختیار کر لیتا تھا اور یہ ضابطہ ہندو مسلم کے حق میں یکساں طور پر نافذ العمل تھا۔[۵۸] اسی طرح اگر کوئی شخص چوری یا ڈکیتی کرتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تو جو کچھ اس کا اپنا اثاثہ اس کے پاس سے برآمد ہوتا اسے بیت المال میں داخل کر دیا جاتا۔[۵۹] یہ صورت غالباً اس وقت اختیار کی جاتی

رہی ہو گی جبکہ چور یا ڈاکو نامعلوم اشخاص ہوں اور ان کے گھر بار کا کچھ پتہ نہ ہو۔ جہاں تک مسروقہ (چرایا ہوا) مال کا تعلق ہے اس کے بارے میں اورنگ زیب نے شرعی ضابطہ کے تحت صاف صاف یہ حکم جاری کیا تھا کہ اگر وہ برآمد ہو جائے اور اس کا مالک معلوم ہو تو ملکیت کی قطعی شہادت ملنے پر وہ مال اس کے حوالے کر دیا جائے اور اگر اس کا مالک مجہول ہو تو اُسے بیت المال میں داخل کر دیا جائے۔[60] اسی طرح اورنگ زیب کے تعزیری قوانین میں یہ جزئیہ بھی ملتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کو کیمیاگر ظاہر کرتے ہوئے کسی کا مال ہڑپ لیتا ہے تو اسے قید میں رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے اور جو مال اس نے غلط طریقے سے حاصل کیا تھا اسے اس کے مالک کے حوالہ کر دیا جائے گا اگر وہ معروف و موجود ہو ورنہ پھر اسے بیت المال کے اموال میں شامل کر دیا جائے گا۔[61] مزید برآں بادشاہ نے بعینہٖ یہی قانون اس مال کے بارے میں بھی لاگو کیا تھا جس سے جوا کھیلا جاتا تھا۔ جوا بازوں کو قید و بند کی سزا دی جاتی تھی اور جوئے میں لگایا گیا یا جیتا ہوا مال مالک کے حوالہ کر دیا جاتا بشرطیکہ وہ موجود ہوتا ورنہ پھر اسے بیت المال میں داخل کر دیا جاتا۔[62]

اورنگ زیب نے ان تحائف و ہدایا کو بھی بیت المال کا حق قرار دیا تھا۔ جو صوبہ کے گورنروں کو پیش کیے جاتے تھے اس کا ایک واضح ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ جب بادشاہ کو یہ خبر ملی کہ شہزادہ محمد اعظم بہادر شاہ (جو باری باری ملتان، بہار، بنگال، گجرات، خاندیش اور اورنگ آباد کے صوبے دار کے عہدہ پر فائز ہوئے) حکومت کے افسران و امراء کی جانب سے پیش کیے جانے والے تحفے و تحائف کو واپس کر دیتے تھے تو خط کے ذریعہ اس عمل کے خلاف شہزادہ کو تنبیہ کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ سراسر بیت المال کا نقصان ہے۔[63] اس سے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بادشاہ کو موصول ہونے والے تحائف و ہدایا بھی بیت المال کی آمدنی کا ذریعہ بنتے رہے ہوں گے۔ یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہو گا کہ مورخین کے بیان سے سلطان سکندر لودی کی بابت یہ شہادت ملتی ہے کہ اس نے یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ اسے دوسرے ممالک کے حکمرانوں سے جو تحفے تحائف وصول ہوں یا امراء (افسران) کی جانب سے عرضداشتوں کے ساتھ جو نذرانے پیش کیے جائیں انھیں بیت المال میں نہ داخل کیا جائے بلکہ اس کے لیے ایک الگ خزانہ قائم کیا جائے اور اس (سلطان) کے حکم کے مطابق انھیں صرف میں لایا جائے۔[64]

اسی طرح سلطان فیروز شاہ کے بارے میں معاصر مورخ عفیف یہ ذکر کرتے ہیں کہ جب ملک بشیر، جو سلطان کے خاص غلاموں میں سے تھے اور حکومت کے اہم عہدہ داروں میں

شامل تھے) نے ایک کروڑ دام بطور نذرانہ (مال تسلیم) سلطان کی خدمت میں پیش کیا تو اول اس نے قبولیت سے انکار کیا لیکن جب ملک بشیر کے اصرار پر اسے قبول کیا تو صاف صاف یہ ہدایت جاری کی کہ اسے بیت المال کا حصہ نہ بنایا جائے بلکہ اسے علٰحدہ رکھا جائے۔[۶۵] کہیں سے یہ وضاحت نہیں مل پائی ہے کہ اورنگ زیب نے کن بنیادوں پر گورنروں یا حکومت کے اہم افسروں کو پیش کیے جانے والے ہدایا وہ تحائف پر بیت المال کا حق تسلیم کیا تھا۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ متعلقین حکومت (خواہ بادشاہ ہو یا اس کے ماتحت افسران) کو ہدایا اور نذرانے ان کی ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ ان کے منصب و عہدہ کی وجہ سے ملتے تھے اس لیے ان پر بجا طور پر عوام کا اجتماعی حق ثابت ہوتا ہے۔ بیت المال اس کے وصول کرنے اور خرچ کرنے کا ذمہ دار ہے۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بیت المال کے وسائل مختلف النوع تھے اور یہ کہ معروف وسائل کے علاوہ اس وقت بعض ایسی چیزیں اس کے ذرائع آمدنی میں شامل تھیں جن کا ذکر اولین مسلم تاریخوں میں نہیں ملتا۔ مزید براں مذکورہ مباحث سے یہ ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے کہ بیت المال کے وسائل کے کچھ متعین اصول وضوابط تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ بغیر کسی قید و بند کے ہر طرح کے مال کو بیت المال میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ اس پر ایک دلیل اس سے بھی ملتی ہے کہ جب بھی بیت المال میں کسی چیز کے داخل کیے جانے کے بارے میں حکومت کے عملہ میں اختلاف ہوتا یا اس ضمن میں کوئی نئی صورت حال سامنے آتی تو بادشاہ سے رجوع کیا جاتا اور اس کے فیصلہ کے بعد ہی کوئی اقدام کیا جاتا۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب کے عہد میں پرگنہ میرٹھ (راجستھان) کے کچھ ہندو تاجروں نے ایک سو سے زاید دکانوں کا کرایہ وہاں کے بت خانوں کے لیے وقف کیا تھا کچھ عرصہ بعد یہ بت خانے منہدم ہو گئے۔ قاضی محمد اکرم یہ چاہتے تھے کہ وقف شدہ دکانوں کا کرایہ بیت المال میں داخل کیا جائے اور بت خانوں کا ملبہ بیچ کر اس کی قیمت بھی بیت المال کی آمدنی میں شامل کر دی جائے۔ ہندو تاجر اس پر معترض ہوئے اور یہ دعویٰ کیا کہ دکان اور بت خانوں کا ملبہ ان کی ملکیت ہے اس لیے ان کے حوالہ کیا جائے۔ بادشاہ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے صوبہ کے واقعہ نگار دریافت کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کیا فیصلہ لیا جائے۔[۶۶] اسی طرح اس صوبہ کے پرگنہ دیندوانہ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ ٹھاکری کا نام کا ایک شخص (جو سیورہ فرقہ سے تعلق

رکھتا تھا) ۱۶۷۸ء میں وفات پا گیا۔ اس کی چھوڑی ہوئی منقولہ وغیر منقولہ جائداد تقریباً دو ہزار روپئے کے برابر تھی۔ اس کے فرقہ کے لوگ کسی جگہ مستقل بود وباش نہیں رکھتے تھے اور ان کی متعین معاشرتی زندگی بھی نہیں تھی اس لیے اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ وہاں اس کے صرف دو شاگرد تھے اور اس کا ترکہ بھی انھیں دونوں نے قبضہ میں تھا۔ یہاں بھی اس وضاحت کے ساتھ بادشاہ کا فیصلہ معلوم کیا جاتا ہے کہ شریعت کی رو سے (لاوارث) متوفی کے ترکہ پر بیت المال کا حق مترتب ہوتا ہے۔[۶۷] اگرچہ دونوں واقعات کے سلسلہ میں متعلقہ آخذ سے یہ صراحت نہیں ملتی کہ بادشاہ نے کیا فیصلہ صادر فرمایا لیکن اس سے بہر حال یہ ثابت ہوتا ہے کہ بیت المال موقع سائل ایک نظم کے تحت جمع ہوتے تھے اور اس سے متعلق نئے اور اختلافی مسائل میں آخری فیصلہ بادشاہ کی صوابدید پر منحصر ہوتا تھا۔

جہاں تک عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بیت المال کے وسائل کو خرچ میں لانے کا تعلق ہے نظری طور پر اموالِ بیت المال میں عوام کا اجتماعی حق تسلیم کیا جاتا تھا اور یہ تصور قائم تھا کہ اس کے وسائل کو عوام کی فلاح وبہبود کے کاموں میں صرف کیا جائے۔ اس کے علاوہ سلطان یا بادشاہ بیت المال میں بس اتنا ہی اپنا اختیار سمجھتے تھے۔ جتنا کسی مال یا جائداد پر اس کے امین یا نگراں کا ہوتا ہے۔ سلاطین دہلی میں ناصر الدین محمود (۱۲۴۶ء — ۱۲۶۶ء) کا واقعہ بہت ہی مشہور ہے کہ جب ان کی اہلیہ نے بیت المال سے گھر کے کام کاج کے لیے ایک خادمہ کی فراہمی کا مطالبہ کیا تو سلطان نے جواب دیا کہ بیت المال خدا کے بندوں کا حق ہے۔ مجھے اس میں ذاتی تصرف کا کوئی اختیار نہیں ہے۔[۶۸] سلطان علاء الدین خلجی نے جب قاضی مغیث سے یہ دریافت کیا کہ بیت المال میں اس کے اور اس کے متعلقین کا کس قدر حصہ ہے تو قاضی نے ان الفاظ میں وضاحت کی کہ خلفاء راشدین کی اتباع اگر مقصود ہے تو اسے بیت المال سے صرف ایک عام سپاہی کی تنخواہ کے بقدر (۲۳۴ تنکہ) لینا چاہیے۔ اگر میانہ روی مطلوب ہو تو امراء وارکین سلطنت کے اخراجات کے بقدر تصرف میں لائیں لیکن اگر وہ بادشاہ وامراء میں کچھ امتیاز رکھنا چاہتے ہوں تو وہ امراء سے کچھ زیادہ لے سکتے ہیں۔[۶۹] سلطان غیاث الدین تغلق کی بابت معاصر مورخ برنی کی یہ شہادت قابل ذکر ہے کہ بیت المال کے لیے حصول وسائل اور ان کے مصرف دونوں میں وہ شریعت وعقل کے مطالبات کا پاس ولحاظ رکھتا تھا اور کسی ایسی داد ودہش کو روا نہیں رکھتا تھا جس سے اسراف اور تلفِ بیت المال ظاہر ہو۔[۷۰]

اس پر ایک قوی ثبوت اس سے فراہم ہوتا ہے کہ سلطان نے تخت نشینی کے بعد ان تمام رقوم کی بازیابی کی کوشش جنھیں ان کے پیشرو خسرو خاں نے حکومت کے متعلقین، عوام اور علماء و مشائخ میں ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بے تحاشہ تقسیم کی تھی۔ واپسی رقوم کے مطالبہ پر دیگر اصحاب سے قطع نظر شیخ نظام الدین اولیاء نے جو جواب دیا تھا وہ خود بیت المال کے مصرف پر دلالت کرتا ہے۔ سلطان المشائخ نے اس وقت یہ فرمایا تھا کہ یہ بیت المال (کا مال) تھا جو اس کے مستحقین تک پہنچ گیا (ایں بیت المال بود باہل استحقاق رسید)[۷۱] یہ ملحوظ رہے کہ شیخ نظام الدین نے خسرو خاں کی دی ہوئی رقوم نذرانہ کو غرباء و مساکین میں تقسیم کر دی تھی۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے نہ صرف بیت المال کے وسائل کو شریعت کے تحت منضبط کیا بلکہ اس کے مصارف میں بھی شریعت کی حد بندیوں کا پاس و لحاظ رکھا۔[۷۲] عہد شاہجہانی کے مورخ محمد صادق بیت المال میں اجتماعی حقوق پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بیت المال میں تمام مسلمانوں کے حقوق جملہ فقہی مذاہب سے ثابت ہیں۔[۷۳] اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے فرامین و خطوط میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ بیت المال بندگان خدا کا حق ہوتا ہے اور حکمراں یا خلیفۂ وقت کی حیثیت محض اس کے امین کی ہے (بیت المال حقِ عبادات و خلیفہ امین و نوکران گماشتہای خلیفہ اند)[۷۴] بیت المال میں ذاتی طور پر احتیاط کے علاوہ بادشاہ بیت المال کے نظم و نسق سے تعلق رکھنے والے عملۂ حکومت کو بھی اس بات کی برابر ہدایت کرتے رہتے تھے کہ وہ بیت المال کے وسائل کو ناحق تصرف میں نہ لائیں مثال کے طور پر وہ عتیق اللہ خاں بخشی کو ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنے اہل و عیال کے لیے بیت المال سے کچھ نہ حاصل کرے اور اگر وہ بڑھاپے یا کسی عارضہ کی وجہ سے کسب معاش سے عاجز ہو تو وہ مقامی مسلمانوں کے مشورہ سے ایک سے تین درہم تک لے سکتا ہے اس سے زیادہ کا وہ مجاز نہیں ہے۔[۷۵]

بیت المال کے مصارف کے بارے میں اس عہد کی فقہی تالیفات میں یہ صراحت ملتی ہے کہ مختلف ذرائع سے اسے جو کچھ آمدنی حاصل ہو اسے الگ الگ مدات میں خرچ کیا جائے فتاوای فیروز شاہی کی تصریح کے مطابق بیت المال کی آمدنی کے چار شعبے قائم کیے جائیں گے اور ان میں سے ہر ایک کے مصارف علٰحدہ ہوں گے مثلاً زکوٰۃ کے محاصل قرآن کے بیان کردہ آٹھ مصارف میں خرچ کیے جائیں گے اور لاوارث اموال سے پل و سرائے کی تعمیر جیسے عوامی فلاح

وبہبود کے کام انجام پذیر ہوں گے۔[۷۶] لیکن جہاں حکومت یا بادشاہ کی جانب سے مختلف کاموں کے لیے خرچ کا ذکر آتا ہے وہاں اکثر بیت المال کے بجائے سرکاری خزانہ کا حوالہ ملتا ہے اور جس طرح معاصر مآخذ میں حکومت کے ذرائع آمدنی کے ضمن میں بیت المال کے حوالے بکثرت دستیاب ہیں اخراجات کے سلسلے میں ان کی بنسبت بیت المال کی اصطلاح بہت کم استعمال کی جاتی ہے بیت المال کی آمدنی سے خرچ کا ذکر زیادہ تر فقرا و مساکین کی اعانت اور رفاہی کاموں کے ذیل میں ملتا ہے بلکہ بعض مآخذ میں غربا، و مساکین کی مالی امداد کو ہی بیت المال کا خاص مصرف بتایا گیا ہے۔[۷۷] ظاہر ہے کہ بیت المال کا یہ تصور اس تصور سے میل نہیں کھاتا جس کی تفصیلات وسائل حکومت کے سیاق میں پیش کی گئی ہیں۔

تقریباً تمام سلاطین وملوک کے بارے میں مورخین یہ ذکر کرتے ہیں کہ وہ سلطنت کی آمدنی کا ایک حصہ فقرا، و مساکین کی اعانت اور دیگر کار خیر میں خرچ کرتے تھے اور بعض اوقات یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ وہ اجتماعی فلاح بہبود کے کاموں کے لیے بیت المال کے وسائل تصرف میں لاتے تھے سلطان التتمش کی بابت اسی عہد کے مورخ فخرالدین مبارک شاہ ذکر کرتے ہیں کہ اس نے علما، و فضلا، کے لیے حکومت کے خزانے سے وظائف و انعامات جاری کیے اور فقرا و مساکین اور بیواؤں و یتیموں کی مالی اعانت میں کافی دلچسپی لی۔[۷۸] سلطان ناصرالدین محمود کے بارے میں بھی یہ شہادت ملتی ہے کہ وہ خراج و ممالک محروسہ کی آمدنی سپاہیوں کی تنخواہ، درویشوں کے نذرانے علما، و مشائخ پر انعامات، مساکین و بے سہارا کی مالی اعانت اور مساجد و خانقاہ، سرائے و پل کی تعمیر میں صرف کرتا تھا۔[۷۹] صاحب مسالک الابصار کے بیان کے مطابق سلطان محمد بن تغلق نے دہلی میں بھیک مانگنے پر پابندی عاید کی اور فقرا و بے سہارا لوگوں کے لیے سرکاری خزانہ سے روزینہ جاری کیا۔[۸۰] اور اسی مآخذ میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ سلطان روزانہ چالیس ہزار فقرا میں فی کس ایک درہم نقد اور کھانے پینے کا سامان تقسیم کرتا تھا۔[۸۱] فیروز شاہ تغلق کے بارے میں عفیف کا یہ بیان قابل ذکر ہے کہ وہ سالانہ ۳۶ لاکھ تنکہ فقرا و مساکین کو مالی امداد بہم پہونچانے میں صرف کرتا تھا۔[۸۲] اور اس نے معذور و بے یار و مددگار لوگوں کی اعانت کے لیے "دیوان استحقاق" کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا تھا۔[۸۳] فیروز شاہ کی اس نیک روش پر ایک ثبوت اس سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ جب ایک بار اس کے دربار میں ایک کثیر العیال بدحال حاضر ہوا تو سلطان نے اپنے وزیر ملک قبول قراخاں کے ذریعہ اس کے بارے میں چھان بین کرائی اور اس کی بدحالی کی تصدیق ہوجانے

پر شہر (دہلی) کی زکوٰۃ وعشور کی مد سے اس کے لیے ایک تنکہ روزینہ جاری کیا۔[۹۸۴] محتاجوں وغریبوں پر سلطان کی داد و دہش کا جائزہ لیتے ہوئے برنی نے لکھا ہے کہ اس کے فیض سے بیت المال کے جملہ مستحقین کو اطمینان خاطر نصیب ہوا۔[۹۸۵]

بیت المال سے فقراء و مساکین اور معذور و بے سہارا افراد کی مالی اعانت کے علاوہ سلاطین دہلی علماء و مشائخ کو بھی ان کے علم و فضل کے اعتراف میں یا ان کی مذہبی خدمات کے عوض انعامات و وظائف سے نوازتے تھے۔ مورخ عصامی کے بقول سلطان ناصر الدین محمود بیت المال کی آمدنی کا معتدبہ حصہ علماء و فضلاء کی نذر کرتا تھا۔[۹۸۶] شیخ نظام الدین اولیاء کے ایک مشہور مرید مولانا فخر الدین مروزی کے بارے میں "خیر المجالس" میں مذکور ہے کہ جب وہ آخر عمر میں کتابت سے معذور ہو گئے اور ان کا گذر بسر مشکل ہو گیا تو سلطان علاء الدین نے ان کے لیے بیت المال سے روزانہ ایک تنکہ مقرر فرمایا لیکن وہ کافی اصرار کے باوجود صرف دو شش گانی (تقریباً بارہ آنے) قبول کرنے پر آمادہ ہوئے۔[۹۸۷] فیروز شاہ تغلق کے بارے میں برنی یہ شہادت پیش کرتے ہیں کہ اس کے زمانہ میں صرف دہلی کے علماء و مدرسین، اہل افتاء و واعظین اور ائمہ و مجاورین کو دیے جانے والے انعامات و وظائف کی تعداد ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں تک پہنچ گئی تھی۔[۹۸۸] یہاں یہ وضاحت بے موقع نہ ہوگی کہ کم از کم فیروز شاہ تغلق اور سکندر لودھی (۱۴۸۹ - ۱۵۱۷ء) کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ وہ دیگر ذرائع آمدنی کے علاوہ ذاتی املاک، تحائف و ہدایا اور پیشکش کی رقوم کو علماء و فضلاء پر خرچ کرتے تھے۔[۹۸۹] مزید براں اہل علم و فضل پر دیگر سلاطین دہلی کے انعام و اکرام کے بہت سے حوالے ملتے ہیں جن کی تفصیل پیش کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ گرچہ سلاطین یا حکومت کی جانب سے فقراء و مساکین کی اعانت اور اہل علم و فضل پر انعام و اکرام کے بہت سے حوالوں میں بیت المال کا ذکر نہیں ملتا لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ بیت المال کے وسائل ان میں صرف کیے گئے ہوں گے، دوسرے یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ بیت المال محض کسی خزانہ یا جمع و خرچ کی جگہ کا نام نہیں بلکہ جمع و خرچ کے وہ تمام اعمال اس کے دائرہ کار میں شامل ہوں گے جن کے لیے بیت المال کا قیام عمل میں آتا ہے۔ چنانچہ بیت المال کے متعلق عام طور پر یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ ہر وہ مال جس کے تمام مسلمان مستحق ہوں اور اس کا کوئی متعین مالک نہ ہو اس پر بیت المال کا حق قائم ہو جاتا ہے خواہ وہ اصلاً بیت المال کے خزانہ میں داخل کیا جائے یا نہ کیا جائے اسی طرح ہر وہ کام جس پر خرچ کرنا عام مسلمانوں کے مفاد میں ضروری ہے وہ بیت المال کے مصارف

میں شمار کیا جائے گا خواہ وہ خرچ کی جانے والی رقم براہ راست بیت المال کے خزانہ سے نکالی گئی ہو یا نہ نکالی گئی ہو جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے۔[۹۰]

عہد سلطنت کی بنسبت شاہان مغل کے زمانہ حکومت میں فقراء و مساکین اور معذورین کی مالی امداد کے ضمن میں بیت المال کے حوالے بکثرت دستیاب ہیں۔ اورنگزیب مدار المہام اسد خاں کے نام ایک خط میں لاوارث مال کے سلسلہ میں ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غرباء وضعفاء کے علاوہ اور کسی کو بیت المال میں کوئی حق نہیں پہنچتا۔[۹۱] اورنگ زیب نے ۱۶۹۶ء میں قاضی ابوالفرح خاں کو احمد آباد کے صوبائی بیت المال کا امین (نگراں) مقرر کرتے ہوئے ہدایت جاری کی کہ ہر سال موسم سرما میں وہاں کے فقراء و مساکین میں پندرہ سو قبا اور پندرہ سو کمبل تقسیم کیے جائیں۔[۹۲] بادشاہ نے اسی نوع کا حکم بالخصوص قیدیوں کے بارے میں صادر فرمایا کہ جاڑے کے موسم میں ہر غریب قیدی کو بیت المال سے موسم سرما میں ایک قبا، ایک سروال (شلوار) اور ایک ٹوپی فراہم کی جائے اور گرمی کے دنوں میں ایک چادر، ایک سروال اور ایک ٹوپی دی جائے۔[۹۳] اوپر یہ ذکر کیا گیا کہ عہد زیر بحث میں اگر کوئی شخص بلا کوئی وارث چھوڑے انتقال کر جاتا تھا تو اس کا ترکہ بیت المال کی ملک قرار پاتا تھا اسی طرح اس دور میں یہ قانون بھی رائج تھا کہ اگر کسی متوفی کے اعزاء و اقرباء میں کوئی حیات نہ ہوتا تو مقامی قاضی اس کی تجہیز و تکفین کا نظم کرتا تھا اور اس کے اخراجات بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے۔[۹۴] دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں بھی اس عام دستور کے علاوہ قیدیوں کے سلسلہ میں علیحدہ حکم جاری کیا گیا۔ اورنگ زیب نے ۱۶۸۲ء میں یہ حکم صادر کیا کہ غریب خاندان کے قیدیوں میں سے اگر کوئی فوت کر جائے تو اس کی تجہیز و تکفین کے لیے بیت المال سے دو چادر اور پانچ "مرادی تنکہ" فراہم کیا جائے۔[۹۵]

آج کے سماج میں غریب لڑکیوں کی شادی نے ایک اہم و سنگین مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کے حل کے لیے کچھ سرکاری و غیر سرکاری فلاحی ادارے اپنے اپنے طور پر کوشاں رہتے ہیں۔ عہد وسطیٰ میں بھی یہ مسئلہ موجود تھا گرچہ آج جیسی سنگینی کی حد تک نہیں اس عہد کی مسلم حکومتوں نے اس جانب توجہ دی اور اس کے حل کے لیے اپنے وسائل کو استعمال کیا۔ بعض سلاطین کے دور میں اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لیے مخصوص شعبہ کے قیام کا ذکر بھی ملتا ہے۔ عفیف کے بیان کے مطابق سلطان فیروز شاہ نے غریب لڑکیوں کی شادی

کے انتظام کے لیے "دیوان خیرات" کے نام سے ایک علٰحدہ شعبہ قائم کیا تھا۔ غریب والدین اپنا نام اس شعبہ کے تحت درج کراتے تھے۔ ان کے حالات کی چھان بین کے بعد ان کی لڑکیوں کی شادی کے لیے اس شعبہ سے مالی امداد مہیا کی جاتی تھی[۹۶] اور اسی عہد کے ایک دوسرے ماخذ سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس ادارہ سے غریب لڑکوں کی شادی کے لیے بھی وسائل فراہم کیے جاتے تھے[۹۷] مشہور حکمراں شاہجہاں (۱۶۲۸ — ۱۶۵۷) جو تخت و تاج کی شان و شوکت اور تعمیراتی کارناموں کے لیے زیادہ معروف ہے نے بھی نادار لڑکیوں کی شادی کے لیے حکومت کے وسائل سے ساز و سامان اور نقود و زیورات کی فراہمی کا خصوصی اہتمام کیا۔ معاصر مورخ امین قزوینی کے بقول کوئی ایسا دن نہیں گذرتا تھا کہ اس مد میں دربار شاہی سے ایک خطیر رقم نہ خرچ کی جاتی ہو[۹۸]

عام حالات کے علاوہ قحط یا کسی ناگہانی مصیبت کے شکار لوگوں کی اعانت اور آبادکاری بھی بیت المال کے اہم مصارف میں شامل ہے جس کی تفصیلات فقہی و تاریخی مآخذ میں ملتی ہیں اس بات کے واضح ثبوت دستیاب ہیں کہ عہد وسطیٰ میں ہندوستان کی مسلم حکومتیں جب اس نوع کے حالات سے دوچار ہوئیں تو انھوں نے بھی اپنے وسائل سے مصیبت زدہ افراد کی مالی مدد فراہم کی سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں جب ایک بار سخت قحط پڑا اور گرانی انتہا کو پہنچ گئی یہاں تک کہ عوام بدحالی کا شکار ہو گئے تو اس نے تقریباً چھ ماہ تک سرکاری گودام سے بلا کسی تفریق دہلی کے تمام لوگوں میں کھانے پینے کی چیزیں تقسیم کرنے کا اہتمام کیا۔ ابن بطوطہ کی تفصیلات کے مطابق سلطان کی ہدایت پر قاضیوں اور دوسرے افسروں نے پہلے محلہ وار قحط زدہ اشخاص کی فہرست تیار کی اور پھر ان میں سامان خورد و نوش کی تقسیم کا نظم مرتب کیا[۹۹] عہد شاہجہانی کے مورخ عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ جب ۱۶۴۵ء میں خشک سالی کے سبب پنجاب میں غلہ کی سخت قلت پیدا ہوئی تو بادشاہ نے "خزانہ خیرات" سے دس ہزار روپیے صدر الصدور کے حوالہ کیے کہ وہاں کے مصیبت زدہ لوگوں اور محتاجوں میں انھیں تقسیم کیا جائے[۱۰۰]

اس سے قبل یہ تفصیل سے واضح کیا جا چکا ہے کہ عہد مغلیہ میں بیت المال کے ذرائع آمدنی میں لاوارث اموال و ترکات کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے کہ یہ آمدنی رفاہ عام کے کاموں بالخصوص مساجد، سرائیں، کنویں، تالابوں، نہروں اور پلوں کی تعمیر میں صرف کی جاتی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عہد وسطیٰ کے بعض ہندوستانی فتاویٰ میں لاوارث ترکات کے مصارف میں خاص طور سے اسی نوع کے کاموں کو شامل کیا گیا ہے[۱۰۱]

جہاں گیر کے جاری کردہ بارہ مشہور ضوابط میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لاوارث متوفی کی جائداد حکومت کی تحویل میں لی جائے اور اس سے مسجدیں اور سرائیں تعمیر کی جائیں اور تالاب و کنویں کھودے جائیں۔[۱۰۱] اورنگ زیب کے ایک حکمنامہ میں بھی اسی ضابطہ پر عمل آوری کی تاکید ملتی ہے کہ غیر موروثہ اموال کو مساجد، تالاب اور پل کی تعمیر میں صرف کیا جائے تاکہ متوفی کی روح کو اس کا ثواب پہنچ سکے۔[۱۰۲]

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بیت المال سے فقراء و مساکین کی اعانت معذور و بے سہارا کی کفالت، پریشان حال و مصیبت زدہ کی راحت رسانی یا اہل علم و فضل اور مذہبی لوگوں کے انعام و اکرام کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ زیادہ تر مسلمانوں کی تخصیص کے بجائے عام انداز میں ذکر کی گئی ہیں۔ بلکہ بیت المال میں لوگوں کے اجتماعی حقوق کے اثبات کے ضمن میں بعض معاصر مآخذ میں صاف صاف "حق عباد" و "بندہائے خدا" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔[۱۰۳] مزید براں یہ محتاج بیان نہیں کہ بیت المال کے وسائل سے رفاہِ عام کے جو کام انجام پاتے تھے اس سے مسلم و غیر مسلم سبھی فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس سے قبل یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ مغلیہ حکومت علماء و فضلاء اور دینی خدمات انجام دینے والوں کو نقد کے علاوہ آراضی کا عطیہ بھی دیتی تھی۔[۱۰۴] اور یہ زیادہ تر موات و افتادہ زمینوں کی قبیل سے ہوتی تھیں جو اصولی طور پر بیت المال کی ملک تصور کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں بھی مسلم و غیر مسلم کے مابین کوئی تفریق نہیں برتی جاتی تھی۔ یہ ذکر یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بعض ہندو خاندانوں کو بیت المال کی مملوکہ آراضی سے زمین کا عطیہ دیے جانے کا قطعی ثبوت ملتا ہے۔ اس نے ۱۶۸۷ء میں بنارس کے رام جیون گوسائیں اور اس کی اولاد کو (جو اپنی قوم کے لیے مذہبی خدمات میں مصروف رہتے تھے) گنگا کے کنارے بینی مادھو گھاٹ کے قریب آراضی بیت المال سے تقریباً چھ سو گز کا ایک قطعہ بطور انعام موروثی طور پر عطا کیا تھا۔[۱۰۵] اس نوع کے شواہد سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح اُس عہد میں بعض حالات میں غیر مسلموں کے مال و اسباب بیت المال کے املاک کا حصہ بنتے تھے اسی طرح بیت المال کے وسائل سے بھی ان کے مستحقین کو مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا۔ یہاں یہ صراحت بے موقع نہ ہوگی کہ زکوٰۃ و صدقات کے مصارف میں غیر مسلموں کو شامل کیے جانے کے بارے میں فقہاء کا اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اس پر عام طور پر اتفاق ہے کہ صدقات واجبہ کے علاوہ بیت المال کے

دیگر وسائل سے جس طرح مسلمانوں کی ضروریات وابستہ ہیں اسی طرح غیر مسلمین کی حاجات بھی ان سے پوری کی جا سکتی ہیں[107]۔ اس کے علاوہ خلافت راشدہ میں بیت المال سے ذمیوں کو مالی امداد دینے کی عملی مثالیں بھی ملتی ہیں[108]

جہاں تک بیت المال کے وسائل سے حکومت کی انتظامی ضروریات کی تکمیل یا سرکاری عملہ کو مشاہرہ دینے کا سوال ہے تاریخی کتب اور سرکاری دستاویزات میں اس کا کوئی واضح بیان نہیں ملتا۔ اگر بیت المال یا اس کے مخصوص ذرائع آمدنی سے حکومت کے متعلقین میں سے کسی کو اس کی خدمت کا معاوضہ یا مشاہرہ دینے کا حوالہ دستیاب ہے تو یہ ان لوگوں کے ضمن میں جو قضا و افتاء، تعلیم و تدریس اور احتساب و امامت جیسے مشاغل میں مصروف رہتے تھے[109] اس عہد کی مختلف فقہی تالیفات میں بھی اس مسئلہ پر واضح انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے مثال کے طور پر فتاوای فیروز شاہی کے ایک استفتار کے جواب میں یہ مذکور ہے کہ قاضی، مفتی، معلم اور امام مسجد کو ان کی خدمات کے عوض بیت المال سے تنخواہ دی جا سکتی ہے[110]۔ فتاوای غیاثیہ اور فتاوای عالمگیری کے مباحث سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے[111]۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر قاضی، مفتی اور امام وغیرہ کو بیت المال سے اس وجہ سے حق الخدمت وصول کرنے کا جواز تھا کہ وہ دینی امور اور مذہبی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں مصروف رہتے تھے تو وہ عملۂ حکومت بھی بیت المال سے تنخواہ پانے کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے جو نظم و نسق کی مختلف ذمہ داریوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فوجی انتظام میں مصروف رہنا، شعبۂ محاصل کی ذمہ داریوں کو انجام دینا یا عام نظم و نسق کے کسی کام میں مشغول رہنا حکومت کی بہتر کارکردگی اور اس کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے اس لیے ان تمام مصروفیات کو مسلمانوں کے اجتماعی مفاد میں سمجھنا اور ان سے تعلق رکھنے والوں کو بیت المال سے معاوضہ پانے کا مستحق قرار دینا کسی بھی صورت میں غلط نہ ہوگا۔ اس کا ایک واضح ثبوت اس امر سے فراہم کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی تاریخ کے اولین ادوار میں یہ نظم قائم تھا کہ ہر صوبہ کے بیت المال سے مقامی نظم و نسق کے اخراجات کی تکمیل کے بعد اگر کچھ رقم باقی بچتی تھی تو پھر اسے مرکزی بیت المال کو بھیجا جاتا تھا۔ مزید براں اگر بیت المال سے اس کے وسیع مفہوم میں ایسا مالی ادارہ مراد لیا جائے جو مسلم حکومت کے جملہ ذرائع آمدنی اور مصارف کا نگراں و منتظم ہوتا ہے تو پھر اس بحث کی ضرورت بہت زیادہ باقی نہیں رہتی کہ حکومت کے عملہ اور کارپردازوں میں سے کون لوگ بیت المال سے مشاہرہ پانے کے مستحق ہوں گے

اور کون نہیں۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں حکومت کے جملہ متعلقین بیت المال کے مستحقین میں سے شمار ہوں گے۔

بیت المال سے متعلق ایک اور مسئلہ جو عہد وسطیٰ کے ہندوستانی علماء وفقہاء کے مابین بحث کا موضوع بنا لیکن اس وقت کی حکومتوں کی جانب سے اسے عملی طور پر برتنے کا کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکا یہ ہے کہ اگر کسی وقت بیت المال کے وسائل عوام کی اجتماعی ومعاشی ضروریات اور حکومت کے نظم ونسق کے اخراجات کی تکمیل کے لیے ناکافی ہو جائیں تو کیا حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ بیت المال کے وسائل میں اضافہ کے لیے عوام سے ہنگامی طور پر کچھ مال وصول کرے یا ان پر کوئی نیا محصول عائد کرے۔ متعدد فقہاء نے قرآن وحدیث سے استدلال کرتے ہوئے واضح طور پر یہ رائے پیش کی ہے کہ معاشرہ کے محروم و محتاج افراد کی حاجت روائی اور اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لیے بیت المال کے معروف وسائل کفایت نہ کریں تو اسلامی ریاست کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اصحاب ثروت سے مزید مال حاصل کرے یا عوام پر بقدر استطاعت نیا محصول عاید کرے[۱۱۲]۔ ہندوستان میں مرتب کیے گئے فتاویٰ کے بعض مجموعوں میں اس مسئلہ کی وضاحت ملتی ہے[۱۱۳] اور اسی کے ساتھ اس بات کے دستاویزاتی ثبوت بھی فراہم ہوتے ہیں کہ یہ مسئلہ معاصر علماء کی مجلسوں میں باقاعدہ زیر بحث آیا اور اس پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا[۱۱۴]۔ یہ علماء وفقہاء اس مسئلہ کی بابت اپنے موقف اور طرز استدلال میں فقہاء متقدمین سے کلی طور پر متفق نظر آتے ہیں۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم عہد حکومت میں بیت المال کا تصور نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس کے وسائل اور مصارف کا باقاعدہ ایک نظم قائم تھا اگرچہ مختلف ادوار میں اس کی تفصیلات میں کچھ فرق بھی رونما ہوتا رہا۔ اس عہد میں بیت المال کی باضابطہ کارکردگی پر مزید ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ اس کی حفاظت و نگرانی اور اس کے مشاغل کی تکمیل کے لیے متعدد عہدہ دار مقرر کیے جاتے تھے۔ اصولی طور پر خلیفۂ وقت یا بادشاہ بیت المال کا امین، حقیقی متولی یا نگران اعلیٰ ہوتا تھا اور دیگر شعبوں کے مثل اس باب میں بھی بادشاہ کی رائے ہی غالب ہوتی تھی[۱۱۵]۔ اس ادارہ سے متعلق بادشاہ کی تفویض کردہ ذمہ داریاں حکومت کے مختلف افسران انجام دیتے تھے۔ عام طور پر قاضی بیت المال کے کاموں کی نگرانی کرتا تھا اور بادشاہ کے بعد وہی بیت المال کا امین تصور

کیا جاتا تھا[۱۱۶] لیکن بعض آخذ میں بیت المال کی دیکھ بھال میں قاضی کے ساتھ صدر کا بھی ذکر ملتا ہے[۱۱۷] اسی لیے بعض جدید اسکالرس کی رائے میں قاضی و صدر کا مشترکہ بورڈ بیت المال کی نگرانی کے فرائض انجام دیتا تھا[۱۱۸] بیت المال کے افسر اعلیٰ کے لیے اس وقت "امین بیت المال" یا "بیت المالچی" کی اصطلاحیں رائج تھیں[۱۱۹] بیت المال کے امین یا نگراں کے ماتحت جو کارندے بیت المال کی مصروفیات کو جاری رکھتے تھے ان میں مشرف، داروغہ اور تحویل دار شامل تھے۔ بالخصوص لاوارث اموال اور قرق شدہ جائداد کے حساب و کتاب اور ان کی ضبطی و نگرانی کے کام اکبر کے زمانہ میں مشرف و داروغہ اور بعد کے دور میں مشرف و تحویل دار انجام دیتے تھے۔ اول الذکر میں ان کا افسر اعلیٰ کوتوال ہوتا تھا[۱۲۰] اور موخر الذکر میں دیوان بیوتات ان کی سربراہی کرتا تھا[۱۲۱] بیت المال کے حق میں کسی افسر حکومت کا ضبط کیا جانے والا مال و اسباب میر ساماں کی مہر اور دیوان صوبہ کی تصدیق کے بعد ہی اس کی تحویل میں لیا جاتا تھا[۱۲۲] بیت المال میں کسی متعلقہ افسر کی خرد برد کی اطلاع ملنے پر اس واقعہ کی چھان بین کی جاتی تھی اور اس افسر سے مال مضبوبہ کی وصولی کے لیے مخصوص عملہ متعین کیا جاتا تھا[۱۲۳] صوبہ جات میں بھی بیت المال کے کام کاج کا اصل نگراں قاضی ہوتا تھا اور وہ قاضی القضاۃ و صدر الصدور کے مشورے سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتا تھا[۱۲۴] گرچہ بیت المال کے وسائل و مصارف کے سلسلہ میں بادشاہ کی ہدایت مرکز کے علاوہ دوسرے علاقوں میں صوبائی حکومت کے ذریعہ ہی متعلقہ افسران تک پہونچائی جاتی تھیں[۱۲۵] اور نفاذ میں آتی تھیں لیکن صوبائی حکومت مقامی بیت المال کے کام کاج میں کوئی مداخلت نہیں کرتی تھی۔ صوبائی بیت المال کے لیے امین یا نگراں کا تقرر براہ راست بادشاہ کے ذریعہ عمل میں آتا تھا[۱۲۶] اور یہ اپنے کاموں کے لیے بادشاہ ہی کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا۔ مزید براں بیت المال کی آمدنی یا خرچ سے متعلق کسی مسئلہ میں صوبائی بیت المال کے منتظم اعلیٰ اور مقامی افسران میں اختلاف کی صورت میں شاہی دربار کو رپورٹ بھیجی جاتی تھی اور اس مسئلہ میں آخری فیصلہ بادشاہ کی صوابدید پر منحصر ہوتا تھا[۱۲۷]

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بیت المال سے متعلق مذکورہ بالا شواہد اور ان کے تجزیاتی مطالعہ کی روشنی میں بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد کی مسلم حکومتوں کے تحت بیت المال کی کارکردگی جاری رہی گرچہ مختلف ادوار میں اس کی تفصیلات میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پایا جاتا رہا ہے۔ اس عہد میں لفظ بیت المال کا استعمال اپنے وسیع مفہوم

میں ملتا ہے اور بعض اوقات محدود معنی میں بھی اس کی کارکردگی کی جو کچھ بھی تفصیلات ملتی ہیں ان سے یہ بخوبی عیاں ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ کار محدود ہرگز نہیں تھا بلکہ اس عہد میں بھی اس کے وہ مختلف مشاغل باقی رہے جو اصلاً اس کے قیام سے مقصود ہوتے ہیں۔ اس سے نہ صرف اسلام میں بیت المال کی اہمیت وحیثیت مزید واضح ہوتی ہے بلکہ یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ اس کی معنویت وافادیت ہر دور میں باقی رہی ہے اور آج بھی علیٰ حالہ قائم ہے۔

حواشی ومراجع

سلہ اس موضوع پر تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی، اسلام کا نظریہ ملکیت، دہلی، ۱۹۷۸ء، (گیارہواں باب۔ اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں) ص ۳۹۱ - ۴۰۴

سلہ ۲ بیت المال کے مختلف النوع مشاغل پر مفصل بحث کے لیے دیکھئے راقم السطور کا مضمون "اسلامی ریاست میں بیت المال کی کارکردگی" سہ ماہی تحقیقات اسلامی، ۶/۱ (جنوری۔ مارچ ۱۹۸۷ء) ص ۲۲-۴۴

سلہ ۳ ڈاکٹر علی ابراہیم حسن، التاریخ الاسلامی العام، مکتبہ النہضۃ، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص ۵۳۳

سلہ ۴ ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مطبعۃ الحلبی، مصر، ۱۳۵۷ھ، ص ۲۲۵

سلہ ۵ سرجادوناتھ سرکار، مغل ایڈمنسٹریشن، کلکتہ، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۸ - ۱۱۹

سلہ ۶ عبدالحمید محرر غزنوی، دستور الالباب فی علم الحساب روٹو گراف ۱۷۵ (مخطوطہ رضا لائبریری، رام پور) ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۳۰ الف، فتوحات فیروز شاہی (مرتبہ شیخ عبدالرشید) علی گڑھ، ۱۹۵۴ء ص ۶، سیرت فیروز شاہی، نقل (مخطوطہ اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ) یونیورسٹی کلکشن (مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی) فارسیہ اخبار، ۱۱۱، ص ۱۲۴ شرف بن محمد العطائی فوائد فیروز شاہی، مخطوطہ، جواہر کلکشن، ۶۸۷، مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۲۶ الف

سلہ ۷ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ص ۲۷۸ - ۲۷۹، فتوحات فیروز شاہی، ص ۵-۶

سلہ ۸ منہاج السراج، طبقات ناصری، کابل، ۱۹۶۴ء،

سلہ ۹ ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ص ۲۹۲ - ۲۹۳

سلہ ۱۰ فتوحات فیروز شاہی، ص ۶

۱۱ھ عین الدین ماہرو، انشاء ماہرو (تصحیح پروفیسر عبدالرشید) لاہور، ۱۹۶۵ء، مکتوب ۱۴، ص۱۱۳، ۳۴

۱۲ھ محمد علی کوفی، چچ نامہ، حیدرآباد، ۱۹۳۹ء، ص۱۸۷ ۱۳ھ برنی ص۲۹۰-۲۹۲

۱۴ھ ضیاء الدین برنی، فتاوای جہاں داری، روٹوگراف ۶۸ (مخطوطہ انڈیا آفس ایتھ ۲۵۶۳) ریسرچ لائبریری شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۱۲۰ الف

۱۵ھ فتوحات فیروزشاہی، ص۶، سیرت فیروزشاہی، ص۱۲۴، عفیف، ص۳۸۳

۱۶ھ عفیف، ص۳۸۳-۳۸۴ ۱۷ھ چچ نامہ، ص۲۰۸-۲۰۹

۱۸ھ عفیف ص۲۸۴ ۱۹ھ برنی، ص۲۹۲ ۲۰ھ برنی ص۵۷۴

۲۱ھ انشاء ماہرو (منشور ۲) ص۹ ۲۲ھ عفیف، ص۲۸۳ ۲۳ھ چچ نامہ ص۲۱۹-۲۲۰

۲۴ھ فخر مدبر، تاریخ فخرالدین مبارک شاہ (تصحیح سرڈینی سن راس) لندن، ۱۹۲۷ء ص۳۳-۳۴

۲۵ھ فخر مدبر، آداب الحرب والشجاعت (تصحیح احمد سہیلی خوانساری) تہران ایڈیشن ص۴۰۴

۲۶ھ انشاء ماہرو، محولہ بالا مکتوب ۲۸، ص۶۳

۲۷ھ سید محمد کرمانی، سیرالاولیاء، لاہور ۱۹۷۸ء ص۶۳ غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، حیدرآباد ۱۹۱۳ء ۱/۱۲۱۱ ابوالفضل، آئین اکبری، نولکشور، ۱۲۹۷ھ، ۱/۲۰۴

۲۸ھ فتوحات فیروزشاہی، ص۶، سیرت فیروزشاہی، ص۱۲۴، فوائد فیروزشاہی، ۲۴۶ الف، ڈاکٹر وحید مرزا، دیوان مطہر کڑہ، اورینٹل کالج میگزین (لاہور) ۳/۱۳ (مئی ۱۹۳۵ء) ص۱۳۱ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے راقم الحروف کا مضمون "عہد فیروزشاہی کا نظام محاصل شرعی قوانین کی روشنی میں" تحقیقات اسلامی، ۳/۱ (جنوری-مارچ ۱۹۸۴ء) ص۲۸-۴۲

۲۹ھ ملاحظہ کریں راقم کا مضمون "آراضی ہند کی شرعی حیثیت عہد مغلیہ کے علماء کی نظر میں" ماہنامہ برہان (دہلی) ۳/۹۲، ۶ (مارچ وجون ۱۹۸۴ء) ص۷-۲۳، ۹-۲۶

۳۰ھ فتاوای غیاثیہ، بولاق، مصر، ۱۹۰۹ء، ص۴۸-۴۹، فتاوای فیروزشاہی، اوراق ۲۴۸ الف ۲۴۹ ب دستورالالباب فی علم الحساب، ورق ۳۰ الف، فتوحات، ص۶، سیرت فیروزشاہی ص۱۲۴ فوائد فیروزشاہی، ۲۴۶ الف ۳۱ھ فتاوای جہانداری، ورق والف

۳۲ھ عفیف، ص۴۴۹ ۳۳ھ فتاوای فیروزشاہی، ورق ۷۳ ب

۳۴ھ اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ کریں راقم الحروف کا انگریزی مضمون "Zakat and its Connotation in Medieval India" Islamic

Culture (Hyderabad) Vol 58, No. 3. July-Sep 1984 PP. 233-44

۳۵؎ انشاء ماہرو، مکتوب ۲۶، ص ۶۰، نیز دیکھئے فتوحات فیروز شاہی، ص ۶، عفیف، ص ۴۹۴

۳۶؎ ابو الفضل، آئین اکبری، نولکشور، ۱۲۹۷ھ ۱/۸ ۳۷؎ سرجادوناتھ سرکار، محولہ بالا، ص ۱۲۳

۳۸؎ بدایونی ۲/۳۹۰ - ۳۹۱ ۳۹؎ علی محمد خاں، مرات احمدی، کلکتہ، ۱۹۲۵ء (ضمیمہ) ص ۱۲۸

۴۰؎ رقعات عالمگیری، کانپور، ۱۲۷۳ھ، مکتوب ۸۲، ص ۲۳

۴۱؎ ایس داس ناگر، فتوحات عالمگیری، روٹوگراف ۴۲، ریسرچ لائبریری شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اوراق ۴۷ الف ۴۷ ب، ۱۱۱ ب مرآت احمدی، ۱/۲۹۶، ۲۹۷ - ۳۰۴، ساقی مستعد خاں، مآثر عالمگیری ص ۱۷۴-۱۷۵، ۲۰۸، ۵۲۹، وقائع اجمیر، نقل ۷۸-۷۹، ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱/۳۰۵، ۲/۲۲۳، ۴۲۳، ۷۴

۴۲؎ حمید الدین خاں، احکام عالمگیری، کلکتہ، ۱۹۲۸ء، ص ۵۳-۵۴

۴۳؎ خافی خاں، منتخب اللباب، کلکتہ، ۱۸۶۰ء-۷۴ء، ۲/۲۲۹ - ۲۳۰، مرآت احمدی، ۱/۲۵۸، ۲۶۳، ۲۶۵، ۲۹۸ - ۲۹۹، دار العلوم، روٹوگراف ۱۸۵، ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۵۹ ب ۶۰ الف

۴۴؎ مرآت احمدی، ۱/۲۹۸ - ۲۹۹، منتخب اللباب، ۲/۲۳۰

۴۵؎ معاصر مآخذ میں اصلاً "زکوٰۃ یا محصول" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن اس سے مراد عشور (کسٹم ڈیوٹی یا چنگی) ہے جیسا کہ اس سے قبل وضاحت کی جاچکی ہے۔

۴۶؎ الماوردی، محولہ بالا، ۲۳۵ - ۲۳۶، ابویوسف، کتاب الخراج، قاہرہ ۱۳۰۲ھ، ص ۷۸، فوائد فیروز شاہی، ورق ۲۴۶ الف، فتاوای عالمگیری، بیروت، ۱۹۸۰ء، ۱/۱۹۰-۱۹۱

۴۷؎ مرآت احمدی (ضمیمہ)، ص ۱۸۵

۴۸؎ فتاوای عالمگیری، ۴/۴۰۲ - ۴۰۳، محمد بن عبد الرشید، السراجی فی المیراث، دیوبند، ۱۹۳۸ء

۴۹؎ عبد القادری بدایونی، منتخب التواریخ، کلکتہ، ۱۹۶۸، ۲/۳۹۱

۵۰؎ تزک جہانگیری، علی گڑھ ۱۹۶۳-۶۴ء، ص ۴

۵۱؎ مرآت احمدی، کلکتہ، ۱۹۲۸ء، ۱/۲۶۷

۵۲؎ اس موضوع پر مفصل بحث کے لیے دیکھئے راقم السطور کا انگریزی مقالہ
"The Mughal System of Escheat and the Islamic Law of

Inheritance" Islamic Culture (Hyderabad) Vol. 62 No. 4 Oct. 1988 (in Press)

۵۵۳ اللہ باد ڈکومینٹ (یوپی اسٹیٹ آرکیوس، الہ آباد) نقل ۵۳ (ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ۲/۵۳، ۵۵۔

۵۵۴ عہد مغلیہ میں حکومت کی جانب سے اہل علم وفضل وبزرگان دین کو نقد انعام ووظیفہ کے علاوہ زمین کا عطیہ دینے کا بھی رواج تھا۔ اس نوع کے عطیہ کو اس وقت کی اصطلاح میں "مدد معاش" کہا جاتا تھا، یہ عطیہ معطیٰ بہ کے علم وفضل کے اعتراف میں یا اس کے برکات کے حصول کے لیے دیا جاتا تھا بعض اوقات اس کے ساتھ کوئی انتظامی خدمت بھی مشروط ہوتی تھی، تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں Rafat Bilgrami, Religious and Quasi-Religious Departments of the Mughal Period, Aligarh 1984- PP. 59-98

۵۵۵ یہاں یہ ملحوظ رہے کہ حنفی مسلک کے مطابق ان علاقوں میں جہاں فتح بزور حاصل ہوئی ہو امام (حکمراں) کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہاں کی زمین کو غانمین میں تقسیم کردے یا مناسب سمجھے تو سابق مالکین کے قبضہ میں چھوڑ دے اور ان پر خراج عاید کرے۔ پہلی صورت میں زمین عشری ہوگی اور دوسری صورت میں خراجی متصور کی جائے گی (امام ابو یوسف، کتاب الخراج قاہرہ ۱۳۰۲ھ، ص ۳۵، ۳۶ ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، قاہرہ ۱۹۰۹ء ص ۱۲۲، برہان الدین علی المرغینانی، الہدایہ لکھنو ۱۸۷۶ء، ۲/۵۴۴ - ۵۴۵)

۵۵۶ اسی دلیل سے یہ جزئیہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ ان زمینوں پر خراج کے عوض سابق مالکین کا قبضہ بحال کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس لیے کہ وہ مفقود الخبر تھے۔

۵۵۷ آراضی ہند کے بارے میں مغل دور کے ان علماء کے خیالات پر مفصل بحث کے لیے دیکھیں راقم کا مضمون "آراضی ہند کی شرعی حیثیت عہد مغلیہ کے علماء کی نظر میں" ماہنامہ برہان (دہلی) ۹۲/۳، ۶ (مارچ وجون ۱۹۸۴ء) ص ۷-۲۳، ۹-۲۶ (بالترتیب)

۵۵۸ وقائع اجمیر، ۱/ ۶۷ ۵۵۹ وقائع اجمیر، ۱/ ۶۷

۵۶۰ مرآت احمدی، ۱/ ۲۷۸ - ۲۷۹ ۵۶۱ مرآت احمدی، ۱/ ۲۸۱

۵۶۲ مرآت احمدی، ۱/ ۲۸۱ - ۲۸۲

۵۶۳ رقعات عالمگیری، مکتوب ۶۰، ص ۱۸

۶۴ احمد یادگار، تاریخ شاہی، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۹۳۹ء، ص ۶۴، رزق اللہ مشتاقی، واقعات مشتاقی روٹوگراف ۳ (مخطوطہ برٹش میوزیم، آر ۱۹۲۹) ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ورق ۲۷ ب۔

۶۵ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، محولہ بالا، ص ۲۲۴۔ مزید براں فیروز شاہ نے اس محصول کو بھی بیت المال سے علیحدہ رکھا جو اس کی احیاء کردہ زمینِ موات سے وصول ہوتا تھا (عفیف ص ۱۲۹-۱۳۰)

۶۶ وقائع اجمیر، ۱/۸۴ ۶۷ وقائع اجمیر ۱/۶۶-۶۷ ۶۸ بدایونی، ۱/۹۰ نیز دیکھئے عصامی، فتوح السلاطین، مدراس ۱۹۴۸ء، ص ۱۵۶ ۶۹ برنی، ص ۲۹۳-۲۹۴ ۷۰ برنی، ص ۴۳۳ ۷۱ شیخ جمالی، سیر العارفین، مطبع احمدی دہلی ۱۳۱۱ھ، ص ۸ نیز تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں شیخ محمد اکرام، آب کوثر، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۴۵۲ - ۴۵۴

۷۲ سیرت فیروز شاہی، ص ۱۲۴، فتوحات فیروز شاہی، ص ۶

۷۳ محمد صادق خاں، تواریخ شاہجہانی، نقل ۸ (مخطوطہ برٹش میوزیم، آر/۱۶۷۱) ریسرچ لائبریری شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص ۱۴۷، ۱۴۸ ۷۴ رقعات عالمگیری، مکتوب نمبر ۱۰۷، ۱۴۶، ص ۲۹، ۳۹

۷۵ رقعات عالمگیری، مکتوب ۹۴، ص ۲۶ ۷۶ فتاوای فیروز شاہی، اوراق ۲۴۸ ب - ۲۴۹ الف نیز ملاحظہ کریں فتاوائی غیاثیہ، ص ۴۹ ۷۷ رقعات عالمگیری، مکتوب ۱۴۶، ص ۳۹

۷۸ تاریخ فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۵ ۷۹ سجان رائے بھنڈاری، خلاصۃ التواریخ، دہلی، ۱۹۱۸ء ص ۱۹۶ ۸۰ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار (انگریزی ترجمہ اٹواسپیس) علی گڑھ ۱۹۴۳ء، ص ۲۹ ۸۱ حوالہ مذکور، ص ۳۹ ۸۲ تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۷۹، ۳۵۹-۳۶۰

۸۳ عفیف، ص ۳۵۹-۳۶۰ ۸۴ عفیف، ص ۴۴۹ ۸۵ برنی، ص ۵۵۹ ۸۶ عصامی ص ۱۵۴

۸۷ خیر المجالس (مرتب حمید قلندر) تصحیح پروفیسر خلیق احمد نظامی، علی گڑھ، ص ۸۸ ۸۸ برنی، ص ۵۵۹

۸۹ عفیف، ص ۱۲۹-۱۳۰، ص ۲۴۴، عبداللہ، تاریخ داؤدی، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص ۵۰-۵۱

۹۰ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، محولہ بالا، ص ۲۳۵-۲۳۶ ۹۱ رقعات عالمگیری، مکتوب ۱۴۶، ص ۳۹

۹۲ مرات احمدی، ۱/۳۳۸ ۹۳ حوالہ مذکور، ۱/۳۴۰ ۹۴ حوالہ مذکور ۹۵ حوالہ مذکور، ۱/۳۰۵

۹۶ عفیف، ص ۳۴۹ - ۳۵۱ ۹۷ سیرت فیروز شاہی، ص ۲۳۸-۲۳۹ ۹۸ قزوینی، شاہجہاں نامہ، نقل ۱۳-۱۵ (مخطوطہ برٹش میوزیم آر، ۳، ۷) ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲/۲۶۹

۹۹ رحلہ ابن بطوطہ، بیروت، ۱۹۶۴ء، ص ۴۷ ۱۰۰ عبدالحمید لاہوری، بادشاہ نامہ، کلکتہ، ۱۹۶۸ء ۲/۲۴۲-۲۴۳

۱۰۱ فتاوای فیروز شاہی، ورق ۲۴۹ الف ۱۰۲ تزک جہانگیری، ص ۴ ۱۰۳ مرات احمدی، ۱/۱۸۵ ۱۰۴ بدایونی، ۱/۹۰، رقعات عالمگیری، مکتوب ۱۴۶، ص ۳۹ ۱۰۵ دیکھئے فٹ نوٹ ۵۴

۱۰۶ Jnan Clandra, Aurangzeb and Hindu Temples, JOURNAL OF PAKISTAN HISTORICAL SOCIETY Vol. V/4 (Oct. 1957) P. 250

۱۰۷ شامی، ردالمحتار (باب المصرف) ۲/۶۹-۷۰، ۸۲، ہدایہ اولین، کتاب الزکوٰۃ، باب من یجوز دفع الصدقات الیہ ولا یجوز، ص۱۸۷-۱۸۸ ۱۰۸ ابو یوسف، کتاب الخراج، القاہرہ، ۱۳۵۲ھ ص۱۱۹، ۱۲۶، ۱۴۴؛ ابو عبید القاسم بن سلام، کتاب الاموال (اردو ترجمہ، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد) ۱/۱۶۸-۱۶۹؛ یحیٰی بلاذری، فتوح البلدان، بیروت، ۱۹۵۷ء، ص۱۷۷، نیز دیکھئے علامہ شبلی نعمانی، الفاروق، معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۵۶ء ۲/۱۴۳-۱۴۴، ۱۸۱ ۱۰۹ فخر مدبر، ص۳۵، خلاصۃ التواریخ، ص۱۹۶؛ عفیف، ص۱۸۱، رقعات عالمگیری، مکتوب ۱۰۷، ص۲۹، اخبار دربار معلی، ۲۴/ ۱۹۴ ۱۱۰ فتاوای فیروز شاہی، ورق ۷۰ الف ۱۱۱ فتاوای غیاثیہ، ص۴۹، فتاوای عالمگیری، ۱/۱۹۱ — نیز دیکھئے نظام الملک طوسی، سیاست نامہ، تہران، ۱۹۳۰ء، ص ۳۸ ۱۱۲ محمد بن احمد القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، القاہرہ ۱۹۵۲ء، ۲/۲۴۲، ابن حزم، المحلی، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۹ھ، ۶/۱۵۶، فتاولی ابن تیمیہ، بیروت، ۱۳۹۲ھ، ۲۹/۱۸۵-۱۸۶، نیز اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھئے راقم کا مضمون اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں اور مزید محاصل کا مسئلہ - ایک فقہی تجزیہ، تحقیقات اسلامی (علی گڑھ) ۳/۳ (جولائی/ستمبر ۱۹۸۴ء) ص۶۵-۸۹ -

۱۱۳ فتاوای فیروز شاہی، اوراق، ۲۱۷ب - ۲۱۸ الف

۱۱۴ انشاء ماہرو، محولہ بالا، ص۶۸-۶۷ ۱۱۵ رقعات عالمگیری، مکتوب ۱۰۷، ۱۲۶، ص۲۹-۳۰

۱۱۶ مرآت احمدی، ۱/۳۳۸، ۳۴۰، مرآت احمدی (ضمیمہ) ص۱۸۵، وقائع اجمیر، ۱/۶۶-۶۷، ۶۱۳ See for details Rafat Bilgrami, Religious and Quasi-Religious departments of the Mughal Period, Aligarh 1984, PP.123-131

۱۱۷ تواریخ شاہجہانی، ص۱۲۷-۱۲۸، مرات احمدی، ۱/۳۳۸، ڈکشنری خواجہ لیسین، روٹو گراف، ص۲۳۱ (مخطوطہ برٹش میوزیم ایڈ/ ۶۶۰۳) ریسرچ لائبریری، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۸۹ب، الٰہ آباد ڈکومنٹ، ۲/۵۳، ۵۵

۱۱۸ M.B. Ahmad, Administration of Justice in Medieval India Aligarh 1961 P.153 ۱۱۹ بدایونی، ۲/۳۹۰-۳۹۱، مرات احمدی ۱/۱۶۹، ۳۳۸، مرات احمدی (ضمیمہ) ص۱۵۶ ۱۲۰ آئین اکبری ۱/۱۹۸، بدایونی ۲/۳۹۰-۳۹۱ ۱۲۱ تزک جہانگیری، ص۷ مرات احمدی (ضمیمہ) ص۱۸۵، مرات احمدی، ۱/۲۶۷

۱۲۲ مرات احمدی (ضمیمہ) ص۱۸۵ ۱۲۳ احکام عالمگیری، ۴۴/۵۲-۵۳ ۱۲۴ عبدالحمید لاہوری، محولہ بالا، ۲/۴۷-۴۸، ۴۹، مرات احمدی، ۱/۳۳۸، ۳۴۰ ۱۲۵ مرات احمدی، ۱/۲۹۳، ۳۳۸، ۳۴۰، قزوینی، محولہ بالا، ۲/۲۶۹

۱۲۶ مرات احمدی (ضمیمہ) ص۱۸۵، مرات احمدی ۱/۳۳۸، ۳۴۰ ۱۲۷ وقائع اجمیری، ۱/۶۶-۶۷، ۲۱۳؛ ۲/۱۵-۱۶